اجتہادی تحریک

(از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو توانائی عطا کی ہے اسے مصرف کے لحاظ سے دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - ایک پیداواری اور دوسرا تفریحی - لیکن پیداواری اور تفریحی زمروں میں تصرفِ اوقات کا تناسب دال اور نمک کے متماثل ہے - اور جب یہ تناسب ایک فرد کے روزمرّہ کے کاموں میں بدلتا ہے تو وہ فرد روبزوال ہو جاتا ہے - یہی حال پوری قوموں کا ہوتا ہے - پیداواری اور تفریحی طریقوں میں ہمیشہ فرق واقع ہوتا رہتا ہے - جب ایک طریقۂ پیداوار ایک علاقے کی آبادی کو متموّل اور خوشحال نہیں رکھ سکتا ہے تو اس علاقے کے لوگوں کو تفریح کے لئے بہت کم وقت مِل پاتا ہے - اگر اس علاقے کے لوگ بڑھتی ہوئی آبادی کو کسی نئے ترقی یافتہ طریقۂ پیداوار کو اختیار کرکے متموّل نہیں رکھ سکتے تو یہ آبادی ضروریاتِ زندگی کے معیار میں کمی کرکے اپنے وجود کو کچھ دِنوں کے لئے برقرار رکھ سکتی ہے اگر وہ سابقہ معیارِ زندگی اختیار کئے رہنے پر مصر رہتی ہے تو جلد برباد ہو جاتی ہے -

لیکن چونکہ انسان فطری طور سے جدّت پسند واقع ہوا ہے اس لئے وہ نت نئے پیداواری طریقے ایجاد کرتا رہتا ہے - یہی وجہ ہے کہ آج تک انسان اس سرزمین پر بہتر سے بہتر معیارِ زندگی اختیار کرنے کے باوجود زندہ ہے اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جاتا ہے - مثال کے طور پر آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے سلطنتِ برطانیہ میں کبھی سورج غروب

نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جہالت اور بے روزگاری کا شکار تھا۔ کیونکہ پوری قوم پیداواری اور تفریحی زمروں کا تناسب کھو چکی تھی۔ لیکن آج برطانوی سیاسی اقتدار عملاً اپنی قومی حدود میں سمٹ کر رہ گیا ہے وہاں نہ صرف یہ کہ جہالت بھوک اور بیروزگاری کا خاتمہ ہو چکا ہے بلکہ وہاں کے عام لوگوں کا معیار زندگی بیس پچیس سال پہلے کے مقابلہ میں کافی بہتر ہے۔ اب یہ ملک اس پوزیشن میں ہے کہ ہزاروں لاکھوں غیر برطانوی لوگوں کو اپنی معیشت میں کھپا سکے۔ جرمنی اور جاپان کے کارنامے تو اس معاملے میں برطانیہ سے بھی زیادہ نمایاں ہیں۔ ان سب ملکوں کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انہوں نے پیداوار کے نئے طریقہ ایجاد اختیار کئے ہیں جنہیں عام طور سے جدید ٹیکنالوجی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پرتگال ایک سلطنت ہونے کے باوجود ایک پسماندہ ملک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو عصر جدید کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ پرتگیزی لوگ یوروپ کی غریب ترین قوم ہیں۔ حالانکہ ان کے قدرتی وسائل ڈنمارک وہالینڈ وغیرہ کے مقابلے میں اچھے خاصے ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی آبادی یا قوم ضرورت کے ساتھ ساتھ طریقہ پیداوار میں تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار رکھتی ہے تو وہ اپنی حاکمانہ حیثیت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے حاکمانہ حیثیت کا اظہار سیاسی اقتدار کی شکل میں ہوتا تھا۔ اور اب اس نے اقتصادی اقتدار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ امریکہ، جرمنی اور جاپان کے اقتصادی اقتدار کی عالمگیر نوعیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

تقریباً یہی بات پوری انسانیت کے لئے بحیثیت مجموعی کہی جا سکتی ہے۔ اگر

انسان ضرورت کے مطابق طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کرتا رہا اور پیداواری و تقسیمی اوقات کا تناسب باقی رکھ سکا تو اس زمین پر اس کی حاکمانہ حیثیت یا خلیفۂ ارض کی حیثیت برقرار رہے گی۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنے آبا و اجداد کے طریقۂ پیداوار پر فخر کرتے ہیں اور محض اس کے احیار کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں تو ان کا معیارِ زندگی پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر وہ عملاً نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ پورا وقت پیداواری ہی میں کیوں نہ صرف کرے۔ لہٰذا جو بھی کوئی قوم زندہ و خوش حال رہنا چاہتی ہے۔ اسے بدلے ہوئے حالات میں زیادہ ترقی یافتہ پیداواری طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔

ہر طریقۂ پیداوار کے ساتھ ایک نیا تقسیمی ڈھنگ بھی ایجاد ہوتا ہے۔ جو نئی تہذیب کا ایک جزو ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی زوال یافتہ یا رو بہ زوال قوم نئی ترقی یافتہ تہذیب کی طرف راغب ہوتی ہے تو عام طور سے اس کا رجحان پیداواری طریقوں کے بجائے تقسیمی طریقوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ زوال یافتہ قوم کا طریقۂ تعلیم ہوتا ہے۔ جو پوری قوم کو قناعت اور سہل روی کی طرف مائل کرتا ہے اور انہیں سختی و جفاکشی کے راستے سے دور رکھتا ہے۔ یہ دنیا کے مقابلے میں عقبیٰ کی بہتری کا غلط تصور دیکر انہیں مقابلہ سے کترانے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ قصۂ مختصر کسی زوال پذیر قوم کی تعلیم گاہیں قتل گاہیں یا صلاحیتوں کے قبرستان کے مترادف ہوتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت جب عرب کے نواح میں پھیلی تو ان کو جہاں روما کی مضبوط و منظم فوج کا سامنا پیش آیا۔ وہیں ان کو یونان کے اس فلسفہ کا سامنا کرنا پڑا جسمیں الجھ کر یونانی قوم عملی ہونے کے بجائے علمی ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اس کو محض علمی حیثیت سے حاصل کیا۔ اور اس کو اسلامی رنگ

میں رنگ دیا۔ یہ محض جفاکشی اور عملی دنیا سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت کا نتیجہ تھا لیکن اس زمانے کا علم کلام آج بھی اسی طرح پڑھایا جاتا ہے اور اس کو معراج تصوّر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اِس زمانے میں فلسفہ کے میدان میں اس علم کلام کا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ حدیث کی تحقیق میں ہمارے قدیم محدثین نے جو جفاکشی کی اس کا عشر عشیر بھی آج کے علماء میں ناپید ہے۔ فقہا نے جو فقہ آج سے ایک ہزار سال پہلے مرتّب کی آج کل کے علماء اس کا اعادہ کرا دینا ہی کمال سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف دینی تحقیق کے معاملے میں مغربی علما (مستشرقین) وہی رول ادا کر رہے ہیں جو مسلم متکلمین نے اسلامی عروج کے دور میں کیا تھا۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی نئے زمانے میں قدامت پسندوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا بلکہ اس کے برخلاف مجدّدین نے ہی ہمیشہ اہم کام انجام دیئے۔ مثال کے طور پر خود ہندوستان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک جدید دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے دو تحریکیں ساتھ ساتھ ابھریں۔ ایک علی گڑھ اور دوسری دیوبند کے نام سے مشہور ہے۔ اول الذکر کا مقصد مجتہد پیدا کرنے تھے اور موخر الذکر کا مقصد اسلاف کی تقلید پر زور دینا تھا۔

زمانے سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے تقلیدی تحریک بڑی حد تک متموّل خاندانوں میں پھل پھول نہ سکی بلکہ محض غریب و نادار خاندانوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے سکی۔ اجتہادی تحریک اگرچہ بلند پایہ مجتہد پیدا نہ کر سکی پھر بھی اس نے ہندوستانی مسلمانوں پر کافی معاشی معاشرتی اور سیاسی اثرات ڈالے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقلید کی زنجیر توڑ کر اجتہاد کے لئے زمین ہموار کی۔ اور ہندوستانی مسلمانوں میں مقابلے سے کترانے کے بجائے مقابلے کے لئے للکارنے کی ہمّت پیدا کی۔ جو ہمیشہ زندہ قوموں

کا شعار رہا ہے۔ مگر اب علیگڑھ اجتہادی تحریک کا گہوارہ ہونے کے بجائے تقلیدی تحریک کا مرکز ہوتا جا رہا ہے۔ تبلیغی جماعت کے روز افزوں اثرات کی اس کے علاوہ اور کیا توجیہ کی جا سکتی ہے۔ القصہ مختصر ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی موثر اجتہادی تحریک نہ ابھری تو یہ پوری قوم یا تو اپنی موت آپ مر جائے گی یا اگر باقی رہی تو اس کا مقام پست ترین زمروں میں رہ جائے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سے جو لوگ دینی اور دنیاوی امور پر یکساں گہری نظر رکھتے ہیں وہ آگے آئیں۔ اور اجتہاد کے بند دروازے کو پھر سے کھولیں۔ لیکن یہ کام جتنا اہم ہے اسی قدر نازک و پیچیدہ بھی ہے۔ نئی اجتہادی تحریک کا آغاز ایک ایسے ادارہ کی شکل میں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں پری یونیورسٹی سے لیکر پی۔ ایچ۔ ڈی Ph. D تک ہر مضمون کی تعلیم کا انتظام ہو۔ جہاں پر بلند پایہ اساتذہ کا تقرر اور معیاری طلبار کا داخلہ ہو۔ جہاں مقابلہ سے کترانے کے بجائے مقابلہ کیلئے للکارنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کی جائے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں اس خلا کو پورا کرنے کے لئے آغاز ایک کالج سے کیا گیا تھا مگر بیسویں صدی کے آخری دور میں اس کی ابتدا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (Research Institute) سے کی جانی چاہئے۔ اور دھیرے دھیرے پری یونیورسٹی کی طرف جانا چاہئے۔ یعنی زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ابتدا ہی مخالف سمت سے کرنی پڑے گی۔

کیا امت مسلمہ اس گراں بار کو اٹھانے کے لئے تیار ہے جو اس کی زندگی و ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔